ڈاکٹر خالد علوی

فرد کی تربیت کا پیغمبرانہ طریق

آج کا انسان منظم معاشرتی زندگی بسر کر رہا ہے، اسے اس امر کا شاید احساس نہیں کہ اس تنظیم کے حصول تک اسے کتنے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ منظم معاشرتی زندگی نے انسان کو بلاشبہ بے پناہ منفعتیں عطا کی ہیں۔ انسانی کاوشوں نے جو اجتماعی ادارے تخلیق کیے اور پروان چڑھائے ہیں، وہ اس کی فکری وسعتوں اور عملی عظمتوں کا احساس دلاتے ہیں۔ اجتماعی شعور رکھنے والا انسان جب گردوپیش میں معاشرتی، معاشی، سیاسی، تعلیمی اور تفریحی ادارات (Institutions) دیکھتا ہے تو اُسے اطمینان ہوتا ہے۔ اسے اپنی ذات اور علائق کے بارے میں ایک گونہ تحفظ کا احساس ہوتا ہے منظم معاشرے نے انسان کو تحفظ دیا ہے لیکن اس کی بعض انفرادی خوبیاں اور شخصی حسن کی رعنایاں اس سے سلب کر لی ہیں۔

معاشرہ ایک غیر مرئی وجود ہے اور اس کے تمام اجتماعی مظاہر افراد ہی کے ذریعے اور افراد ہی کے حق میں یا خلاف استعمال ہوتے ہیں۔ فرد اور اجتماع کی یہ کش مکش تخریب و تعمیر کا قابلِ توجہ منظر پیش کرتی ہے۔ شکست و ریخت اور بناؤ بگاڑ کی پوری انسانی تاریخ اس کے عزم و عظمت کی داستان ہے۔ بہ ظاہر تو فرد اجتماعی حالات اور معاشرتی ماحول میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے، لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فرد کی باغیانہ حرکت پُرسکون سمندر میں طوفانی لہروں کی شکل اختیار کرتی ہے، اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا اجتماعی ڈھانچہ ڈولتی کشتی کا نظارہ پیش کرنے لگتا ہے۔ نورِ وحی سے محروم علمائے عمرانیات ابھی تک فرد و اجتماع کے رشتے کو سنوارنے میں مصروف ہیں اور تاہنوز آخری و قطعی فیصلہ صادر کرنے کے قابل نہیں۔ انفرادیت پسند فلاسفہ جن میں کانٹ، نطشے اور برگ شامل ہیں۔ اس بات کے مدعی ہیں کہ اصل زندگی صرف انفرادی ہے۔ حیاتِ عمرانی کی بنا اس کے سوا کچھ نہیں کہ شعورِ ذات اپنے تئیں مکانِ بسیط میں پھیلاتا ہے۔ اس کے برعکس اجتماعیت پسندوں کا کہنا ہے کہ چوں کہ فرد کی شخصیت عمرانی ماحول میں نشوونما پاتی ہے اور اس کا اظہار جماعت ہی میں اور جماعت ہی سے

ممکن ہے، نیز اس کے جملہ قوائے ذہنی و روحانی اس مخصوص جماعت کی ضروریات وحوائج کے سانچے میں ڈھلتے ہیں جس میں بخت واتفاق نے اسے جنم دیا ہے، اس لیے اصل چیز اجتماعیت ہی ہے، عہدِ حاضر کی اشتمالیت وفسطائیت اس تخیل کی مظہر ہیں۔

غیر مومنانہ شک کی بجائے علم حقیقی کی صداقتوں کو بنیاد بنانے والوں کے ہاں فرد اور اجتماع کے مابین تعلق کا ایک حیرت انگیز توازن پایا جاتا ہے۔ اسلام انسان کے اجتماعی شعور کو ملحوظ رکھتا ہے، باہمی میل جول سے پیدا ہونے والی اجتماعیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی نشوونما میں معاونت کرتا ہے۔ وہ ایسے فطری اصول مہیا کرتا ہے جن سے اجتماعیت کو تقویت پہنچتی ہے، اس کے لیے صالح بنیادیں فراہم کرتا ہے اور ایسے عوامل کا قلع قمع کرتا ہے جو اس کے اندر بگاڑ کا باعث بنتے ہیں۔ وہ تمام اجتماعی اداروں کے لیے اصول وقوانین فراہم کرتا ہے جن سے مفید اور غیر مفید جمعیتوں کی تمیز پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے فرمایا:

الا کلکم راع وکلکم مسئولٌ عن رعیتہ[1]

سنو! تم سب نگران وذمے دار ہو اور تم سب سے ماتحت افراد کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

یہ امر ملحوظِ خاطر رہے کہ اسلام فرد کی انفرادیت کو بنیاد قرار دیتا ہے اور اجتماعیت کو بالآخر فرد ہی کی صلاح وفلاح کا وسیلہ قرار دیتا ہے[2]۔ تمام انبیا کے مشن میں بالعموم اور خاتم النبیین کے پروگرام میں بالخصوص فرد کی اصلاح وتربیت سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ مدینہ کی مثالی ریاست کی تنظیم اور آئیڈیل معاشرے کی تشکیل انہی تربیت یافتہ افراد کی بہ دولت ہو سکی۔ حضورؐ کی تعلیمات میں فرد کو اس امر کا احساس دلایا گیا کہ وہ اپنے اعمال کا تنہا ذمے دار ہے، جو سزا اسے ملتی ہے اسے کوئی دوسرا نہیں بھگتے گا۔ معاشرتی جرائم کی ایک سزا تو اجتماعی ہے جسے معاشرہ ہی نافذ کرتا ہے، لیکن اس کا انفرادی معاملہ اس کے رب کے ساتھ ہے جسے اس کو ہی نبٹانا ہے، کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہوگا۔ لہٰذا اسے اپنی ذمے داریوں کا احساس کرنا چاہیے اور اپنا فرض پورا کرنے میں دوسرے کا منہ

---

[1] بخاری، ۲: ۷۵

[2] اسلام کا معاشرتی نظام، ص ۲۷

نہیں تکنا چاہیے۔ اسے یہ نہیں دیکھنا کہ فلاں شخص نیکی نہیں کر رہا تو میں کیوں کروں؟ اسے صرف اپنا دامن گناہوں سے محفوظ رکھنا چاہیے۔ اس کا معاشرتی فائدہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنا احتساب کرتا ہے، اپنی اصلاح کرتا ہے اور اپنی برائیوں کے لیے دوسرے کو نمونہ نہیں بناتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر اکا دکا کہیں کوئی کسی نازیبا حرکت کا ارتکاب کر بیٹھے تو وہ اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا ہے، عریاں سمجھتا ہے اور اپنی اصلاح کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم [۵۳]

اپنی فکر کرو، جب تم سیدھی راہ پر چل رہے ہو تو جو شخص گمراہ رہے، اس سے تمھارا کوئی نقصان نہیں۔

فرد کی اس ذمہ دارانہ حیثیت کو مختلف پیرایوں میں اس طرح بیان کیا گیا:

ولا تکسب کل نفس الا علیھا ولا تزر وازرۃ وزر اخری [۵۴]

اور جو کوئی (برا) فعل کرتا ہے تو اس کا نقصان اسی کو ہوتا ہے اور کوئی شخص کسی کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

ان احسنتم احسنتم لانفسکم وان اسأتم فلھا [۵۵]

اگر اچھے کام کرتے رہو گے تو اپنے ہی نفع کے لیے اچھے کام کرو گے اور اگر برے کام کرو گے تو (ان کا) وبال بھی تمھاری جان پر ہوگا۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے فرد کی شخصیت کا ارتقا اور اس کی ذات کی تکمیل بجائے خود مطلوب ہے۔ دین کا مخاطب فرد ہے، خدا کی عبدیت اور اطاعت کی طرف فرد کو دعوت دی گئی ہے۔ حقوق و فرائض فرد پر عائد کیے گئے ہیں۔ امر و نہی کے احکام فرد کو دیے گئے ہیں۔ طاعت و جزا کی امید فرد کو دلائی گئی ہے۔ اس نظامِ فکر و عمل میں فرد ہی وہ اصل اکائی ہے جس کو ابتدا میں عامل کی حیثیت سے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسی کو عقل اور جذبات سے یہ اپیل کرنا ہے، اسی کو اپنی ہدایت اور راہنمائی کا مخاطب بناتا ہے، اسی کی فلاح کا طالب ہے اور اسی کو خسران سے بچانا چاہتا ہے۔ اگر فرد اپنی جگہ ناقص رہ جائے اور اپنی شخصیت کو پستی میں گرا دے تو آخری فیصلے میں اس کی جماعت اور اجتماعی جماعت کی خوبی اس کے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکتی جس سے وہ دنیا میں تعلق رکھتا تھا [۵۶] پھر اس بات کو قرآن مجید نے آخرت کے فکر میں بڑی کثرت

---

۵۳ القرآن ۵ : ۱۴ ۵۴ القرآن ۶ : ۱۶۴

۵۵ القرآن ۱۷ : ۷ ۵۶ اسلام کا نظام حیات، ص ۱۵

سے بیان فرمایا ہے کہ اللہ کی عدالت میں ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت سے پیش ہوگا اور اسی حیثیت سے اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھے گا، یعنی جس طرح فرد کی شخصیت انفرادی ہے، اس کی ذمہ داری بھی انفرادی ہے۔

غیر الہامی معاشروں نے اپنے افراد کی تربیت کا مقصد اچھا شہری بنانا قرار دیا ہے۔ لیکن "اچھا شہری" ایک ایسی اصطلاح ہے جسے ہر اجتماع اپنے معیار پر جانچے گا اور اس کے لیے کوئی ہمہ گیر اصولی ضابطہ نہیں دیا جا سکتا۔ وطن پرستی، نسل پرستی، قوم پرستی، ترک دنیا و علائق دنیا سے بے رغبتی یا اپنے قومی مفاد کی خاطر دوسروں پر ظلم و تشدد تک سب کچھ اچھے شہری کے اوصاف میں آ سکتا ہے۔ اسلام کا مقصد فرد کو ایک اچھا انسان بنانا ہے۔ وہ اس کے جوہر انسانیت کی نشو و ارتقا کا اہتمام کرتا ہے اور اسے رحمت کا پیغامبر بنا کر معاشرے میں بھیجتا ہے۔ اس نے اعلان کیا ہے:

وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم [۴]

تمھاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

پیغمبرانہ نقطۂ نظر سے فرد کی تربیت کا مقصد اس کی شخصیت کی ایسی متوازن تعمیر ہے جس سے نہ صرف یہ کہ وہ خود صالح ہو بلکہ معاشرے میں صالحیت کے نشو و نما کا باعث و داعی بنے۔ یہ صالح اور متقی انسان وہ ہے جو اللہ کی بندگی کرتا ہے اور زندگی کے ہر معاملے میں صرف اللہ تعالیٰ ہی سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ وہ پوری زندگی اس ارشادِ ربانی کا مصداق بن کر رہتا ہے:

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون [۵]

میں نے جنوں اور انسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کے لیے نہیں بنایا کہ وہ عبادت کریں۔

اس تقویٰ شعار اور صالح انسان کی تیاری کے لیے رسول اللہ نے جو جامع پروگرام دیا ہے، اس کے صرف تین اہم اصولوں، تعلق باللہ، اسوۂ حسنہ اور خدمتِ خلق کا ذکر کیا جاتا ہے:

تعلق باللہ

یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ انسانی اعمال کے انضباط کا انحصار فکری یکجہتی و پاکیزگی پر ہے۔ فکری یکجہتی و پاکیزگی

---

۴ القرآن ۴۹: ۱۳ ۵ القرآن ۵۱: ۵۶

کے لیے کسی ایسی ہستی کے ساتھ تعلق ضروری ہے جو انسان کے مادی اور حسی ماحول سے بالاتر ہو۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تربیت کے لیے اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسان کے شعوری تعلق کو بنیاد بنایا ہے۔ قرآن و سنت کی نصوص سے واضح ہوتا ہے کہ جہاں توحیدِ معبودیت اور توحیدِ ربوبیت کے ادراک سے عبودیت کا شعور پختہ ہوتا ہے، وہاں محبتِ الٰہی بندے کی حیاتِ دینی کا مقصود قرار پاتی ہے۔ اس امر کا اہتمام کیا گیا کہ تعلق باللہ ذات کے شعور و لاشعور کا حصہ بن جائے۔ حضور نے بچے کے کان میں اذان کہنے کا طریقہ اختیار فرمایا[1] تاکہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا وہ احساس تازہ ہو جائے جو عہدِ الست میں پیدا ہوا تھا۔ تعلق باللہ ہی وہ واحد اساس ہے جو انسان کو راست روی کی طرف متوجہ رکھتی ہے اور پیغمبرانہ طریقِ تربیت کی بنیاد ہے۔ حضور اکرمؐ انسان کو ایسی تربیت مہیا کرتے ہیں کہ انسان ہر لمحہ اپنے رب سے خاص تعلق رکھتا ہے اور تعامل کی اسی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔ اس میں خشیتِ الٰہی و محبتِ رب کی صفات پیدا ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے منہاجِ زندگی کی جانب رجوع کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ اس کی خلوتیں ہوں یا جلوتیں، عبادت ہو یا عملی جدوجہد، صنعت و تجارت کی مصروفیت ہو یا کاروبارِ سیاست، صلح و آشتی کے لمحات ہوں یا نزاع و جنگ کے اوقات، اس تعلق کی معراج یہ ہے کہ حُبِ الٰہی ہر حال میں غالب ہو۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کا تمام محبتوں پر غالب آنا اسی تعلق کا فطری نتیجہ ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

ومن الناس من یتخذ من دون اللہ اندادا یحبونھم کحب اللہ والذین آمنوا اشد حبا للہ[2]

اور لوگوں میں سے ایسے بھی ہیں جو اللہ کے ہمسر ٹھہراتے ہیں جن سے وہ اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح اللہ سے محبت کرنی چاہیے، لیکن جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل ایک اور آیت میں بیان فرما دی تاکہ کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہے:

قل ان کان آباؤکم وابناؤکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال نِ اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ

---

[1] ترمذی، باب العقیقہ، ج ۶، ص ۳۱۵ [2] القرآن ۲ : ۱۶۵

وجاھد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ واللہ لایھدی القوم الفاسقین۔[1]

(اے رسول) مسلمانوں سے کہہ دیجیے اگر تمھیں اپنے باپ دادا، بیٹے بھائی، بیویاں اور رشتہ دار اور وہ اموال جو تم نے (بڑی محنت سے) کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم بہت ڈرتے ہو اور وہ مکانات جنھیں تم بہت عزیز رکھتے ہو۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی تمھیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہو تو پھر انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ صادر ہو جائے اور یاد رکھو اللہ تعالیٰ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

کتب حدیث میں الحب فی اللہ کے ابواب میں آنحضورؐ کے مختلف ارشادات منقول ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حب الٰہی کمالِ ایمان و دین ہے:

عن انسؓ عن النبی قال! ثلاثۃ من کن فیہ وجد حلاوۃ الایمان: ان یکون اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما، وان یحب المرء لا یحبہ الا للہ وان یکرہ ان یعود فی الکفر کما یکرہ ان یقذف فی النار۔[2]

انسؓ رسول اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں پائی جائیں اسے ایمان کی لذت حاصل ہوگی۔ وہ شخص جسے اللہ اور اس کا رسول سب سے زیادہ محبوب ہو، وہ بندے سے صرف اللہ کی خوشنودی و رضامندی کے لیے محبت کرے اور وہ شخص جو ایمان لایا ہو اور پھر کفر کی طرف واپس جانا ایسا ہی برا جانتا ہو جیسا کہ اس امر کو برا سمجھتا ہے کہ اسے آگ کے اندر ڈالا جائے۔

بندہ جب اپنے رب کی محبت کو اپنے قلب و دماغ میں نشو و نما دیتا ہے اور اس کے فکر و عمل کے تمام دائرے اسی مرکز سے شروع ہوتے ہیں اور یہیں ختم ہوتے ہیں تو پھر اسے محبوبیت و معیت کا مقام حاصل ہوتا ہے جو فی الواقعہ فرد کی زندگی میں معراج کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن پاک میں اسی معیت کی جانب یوں اشارے ملتے ہیں:

ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون[3]

بلاشبہ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو متقی بھی ہیں اور محسن بھی۔

---

[1] القرآن ۹ : ۲۴ [2] بخاری ۱ : ۱۰ - مسلم ۱ : ۴۸ [3] القرآن ۱۶ : ۱۲۸

مصائب و مشکلات میں یہ معیت سکون و اطمینان اور اعتماد و شجاعت کا باعث بنتی ہے حضرت موسیٰ کے احساسِ معیت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

ان معی ربی سیھدین [۲۴]

بے شک میرے ساتھ میرا رب ہے وہ یقیناً میری راہنمائی کرے گا۔

نبی اکرمؐ نے ہجرت کے موقع پر احساسِ تنہائی کو اس بلیغ انداز سے دور فرمایا کہ قلب و جان سکون و طمانیت سے معمور ہو جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا :

لا تحزن ان اللّٰہ معنا [۲۵]

غمگین نہ ہو۔ بلاشبہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

رسول کریمؐ نے اللہ تعالیٰ کے اس رویے کی وضاحت فرمائی ہے جو بندے کی محبت کے نتیجے میں ظاہر ہوتا ہے :

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللّٰہ قال : ان اللّٰہ اذا احب عبداً دعا جبریل فقال انی احب فلانا فاحبہ قال : فیحبہ جبریل ثم ینادی فی السماء فیقول : ان اللّٰہ یحب فلانا فاحبوہ ، فیحبہ اھل السماء۔ ثم یوضع لہ القبول فی اھل الارض : واذا أبغض اللّٰہ عبداً دعا جبریل فیقول : إنی ابغض فلاناً فابغضوہ ، قال : فتبغضونہ ثم توضع لہ البغضاء فی الارض [۲۶]

ابوہریرۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریل کو بلا کر کہتا ہے کہ میں فلاں بندے سے محبت رکھتا ہوں تو بھی اس سے محبت رکھ، پھر جبریل بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور آسمان میں اعلان کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت رکھتا ہے۔ پھر اس بندے کے لیے زمین میں بھی قبولیت رکھ دی جاتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو ناپسند کرتا ہے تو جبریل کو بلا کر کہتا ہے کہ میں فلاں بندے کو ناپسند کرتا ہوں تو بھی اسے ناپسند کر۔ جبریل بھی اسے ناپسند کرنے لگتے ہیں اور آسمان میں

---

[۲۴] القرآن : ۲۶ ، ۶۲ [۲۵] القرآن ۹ : ۴۰

[۲۶] بخاری، کتاب بدء الخلق ۴ ، ۳۵۰ ۔ مسلم، باب اذا احب اللّٰہ عبداً ۸ ، ۴۱ ۔ مؤطا امام مالک ۲ ، ۱۹۰

اعلان کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو ناپسند کرتا ہے تم بھی اسے ناپسند کرو اور پھر اس کے لیے زمین میں بھی ناپسندیدگی رکھ دی جاتی ہے۔

جب مقصود قربِ الٰہی ہے تو اس کے حصول کا طریقہ بھی آنا چاہیے۔ قرآن و سنت نے محبتِ خداوندی اور معیتِ الٰہیہ کے حصول کا طریق بھی بیان کیا تاکہ مسلمان کو کسی طرح کی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ فرمایا:

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ [۱۷]

آپ کہہ دیں: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

آنحضورؐ کی اتباع محبوبیتِ الٰہی کا باعث ہے۔ یہی وہ معیار ہے جس سے راستے اور منزل کا صحیح تعین ہوتا ہے۔ آپؐ نے اس طریقے کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا۔ حدیثِ قدسی ہے:

ما یزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل حتی احببتہ، فاذا احببتہ فکنت سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر بہ ویدہ الذی یبطش بہ ورجلہ التی یمشی بہا وان سألنی لاعطیتہ ولئن استعاذنی لاعیذنہ [۱۸]

بندہ برابر طاعات و عبادات کے ذریعے میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اسے محبوب بنا لیتا ہوں اور جب میں اس سے پیار کرتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور میں ہی اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے طلب کرتا ہے تو میں دیتا ہوں اور وہ میری پناہ چاہتا ہے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں۔

(باقی آئندہ)

---

[۱۷] القرآن ۳ : ۳۱

[۱۸] مشکوٰۃ، کتاب الدعوات، باب ذکر اللہ عزوجل، ۱۹۷ - مسند ۶ : ۲۰۶